

الطائفہ

ایشانگل

افسردگی کے ہاتھوں جل جل تھک گئے ہیں

اے دل ذرا ٹھہر! ہم چل چل کے تھک گئے ہیں

جیسے کہ بے یقینی تعبیر ہو چکی ہو

ہم اہل خواب آنکھیں مل مل کے تھک گئے ہیں

”میاں ویسے خوش قسمت ہو تم کہ تمہیں اس بوڑھی دنیا سے کوئی لے کے جا رہا ہے ورنہ ہم بے چاروں کی تو حسرت ہی رہ گئی کہ کوئی بچہ دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھے ہماری آپ بیتی بھی سنے۔“

اس اولڈ ہاؤس میں مجمع لگائے تمام بوڑھے حضرات آج اکبر میاں کو الوداعی کلمات کہنے آئے تھے جو تین سال سے یہاں رنج و غم کا سامان لیے بیٹھے تھے۔

”بہت ہی کوئی بھلا بچہ ہے تمہارے بہانے ہی سہی یہاں روز آ تو جایا کرتا تھا مگر اب تو تم اسی کے پاس جا رہے ہو اب بھلا کہاں چکر لگائے گا۔“ وہی بزرگ یعنی شفقت میاں افسردگی بھرے لہجے میں ظہیر میاں سے مخاطب تھے۔

”ارے بھئی اتنے خاموش کیوں ہو خوش کیوں نہیں ہو جاتے ایک نئی فیملی ملنے جا رہی ہے تمہیں اس بد بخت

اولاد اور بیوی نے تو اس عمر میں نکال باہر کیا۔ میرا تو چلو کوئی آگے رہا تھا نہ پیچھے مجبوراً اس اولڈ ہاؤس میں پناہ لینی پڑی مگر تم ان بیوی بچوں کا غم منانا بند کرو جو اپنے اعمال خود ہی بگاڑنے پہ تلے ہیں تمہاری خدمت کرنے

”ارے بھئی اتنے خاموش کیوں ہو خوش کیوں نہیں ہو جاتے ایک نئی فیملی ملنے جا رہی ہے تمہیں اس بد بخت اولاد اور بیوی نے تو اس عمر میں نکال باہر کیا۔ میرا تو چلو کوئی آگے رہا تھا نہ پیچھے مجبوراً اس اولڈ ہاؤس میں پناہ لینی پڑی مگر تم ان بیوی بچوں کا غم منانا بند کرو جو اپنے اعمال خود ہی بگاڑنے پہ تلے ہیں تمہاری خدمت کرنے

ٹوٹ کر بے مول ہوئی۔

نکالا جب وہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہ تھا نا جانے کہاں ہوگا کس حال میں ہوگا۔ ”اکبر میاں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ کر ان کے رخساروں کو بھگو گئے۔

”ٹھک ٹھک ٹھک..... دروازے پہ دستک ہوئی تو دروازہ کھول دیا گیا۔

”ارے آؤ آؤ شمس بیٹا! تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے ہم۔“ شفقت میاں نے وجاہت سے بھرپور اس شخص کو دیکھتے ہوئے خوش دلی سے اندر آنے کی اجازت دی۔

”میں آپ کو لینے آیا ہوں آپ تیار ہیں۔“ دوزانو فرش پہ بیٹھتے ان کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوالیہ نگاہوں سمیت پوچھا۔

”میں گناہ گار ہوں بیٹا! میں نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو بنا اس کے قصور کے دھکے دے کر مارتے ہوئے گھر سے نکال دیا مجھ پہ ترس مت کھاؤ میں اسی قابل

”میں نے اپنی دوسری بیوی کی باتوں میں آکر اپنے ہی بچے کو وحشیوں کی مانند مارتے ہوئے گھر سے نکال باہر کیا اور ہمیشہ کے لیے وہ دروازہ اس پہ بند کر دیا..... وہ کہتا رہا ابا میرا کوئی قصور نہیں ہے میں نے زیور چوری نہیں کیے میں نے کوئی بد تمیزی نہیں کی..... وہ کہتا رہا قسم لے لیں ابا جو آپ کی تربیت کے خلاف جا کے کچھ کیا ہو تو مگر میں نے بے دردی سے نظر انداز کیا..... وہ نا جانے کہاں گیا مگر لوٹ کر نہ آیا..... مجھے اسی پہ کیے ظلم کی سزا ملی ہے۔ شفقت کہ میرے بیوی بچے مجھ سے بے زار ہو گئے۔ مجھ بیمار بوڑھے کے پاس بیٹھنے کے لیے دو گھڑی کا وقت نہ بچا ان کے پاس۔ مجھے بوجھ کہا گیا مجھے نحوست زدہ کہا گیا بدبودار ناکارہ اور نا جانے کیا کیا..... مجھے یہاں ایسا چھوڑا کہ پلٹ کر خبر نہ لی مگر یہاں آکر دن رات مجھے میرا بچہ یاد آتا رہا میرا عبداللہ جسے میں نے تب گھر سے



زندگی کا سفر شروع ہوا تھا مگر ان سے معلوم ہوا کہ اب آپ وہاں نہیں بلکہ اولڈ ہاؤس میں رہتے ہیں یقیناً مانیں یہ سن کر اتنی تکلیف پہنچی جتنی شاید آپ کی بے اعتباری پہ بھی نہیں پہنچی تھی..... میں آپ کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ ابا! آپ اب سے میرے ساتھ رہیں گے اپنے بیٹے کے ساتھ.....“

عبداللہ نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے ماتھے سے لگا لیے جبکہ ظہیر میاں کو تو اپنی قسمت پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا ان کا بیٹا انہیں مل گیا تھا وہ بیٹا جسے انہوں نے دھکے دے کر گھر سے نکالا آج وہی انہیں ایک گھر فراہم کرنے والا تھا جبکہ جس کی خاطر نکالا اسی بیوی اور بچوں نے ان کی زندگی کے کئی سال جو رونق، قہقہوں، محبت و مان کی چاہ لیے ہوئے تھے برباد کر دیے۔

آج اتنے سالوں بعد اس کے منہ سے لفظ ”ابا“ سن کر ان کے متھے کیلجے پہ ٹھنڈے پانیوں کی پھوار پھوٹ پڑی تھی۔ دل سے جیسے کوئی بھاری بھر کم بوجھ اتر گیا تھا۔ آنکھوں کو جیسے قرار آ گیا تھا۔

”میرا پیارا بیٹا..... میرا عبداللہ اپنے باپ کو اس کے لیے معاف.....“

”نہیں ابا! معافی تو تبت بنتی ہے جب مجھے آپ سے گلے شکوے ہوں ناراضی ہو۔“ عبداللہ نے نرمی سے ان کی بات کاٹی۔

”ہاں جس وقت آپ نے نکالا تب اتنی سمجھ نہ تھی تو بہت غصہ آیا ناراض تھا مگر پھر سب بھول بھال کر آپ کو دیکھنے اور بات کرنے کے لیے ترستار ہا الٹا یہ سوچتا رہا کہ بس ایک بار آپ کو اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلا دوں۔“ عبداللہ ابھی تک ان کے ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

”بھئی بہت مبارک ہو ظہیر میاں! قسمت تو اصل معنوں میں اب جاگتی ہے تمہاری اس اولڈ ہاؤس نے پہلی بار ہی سہی مگر کسی کی قسمت کا تارہ تو روشن کیا۔“ شفقت میاں مبارک باد دیتے ہوئے۔

ہوں، تم چلے جاؤ شمس مجھے میری بوٹی ہوئی فصل کاٹنے دو مجھے میرا کیا بھگتے دو میں خطا کا پتلا ہوں مجھے میری خطاؤں کی گھنٹی کے کڑوے پھل لگنے دو۔“ ظہیر میاں دونوں ہاتھوں کو نئی میں حرکت دیتے ہوئے اسے انکار کرنے لگے۔

”میں یہ سب جانتا ہوں۔“ وہ آزر دگی سے بولا۔ سب نے استعجاب سے اسے دیکھا اور استفسار کیا کہ وہ کیسے جانتا ہے۔

”کیونکہ میں ہی عبداللہ ہوں..... آپ کا وہ بیٹا جس پہ آپ نے ناجانے کیوں اعتبار نہ کیا، جس کے لفظوں کی صداقت پہ آپ نے اپنی سماعتوں اور فریادوں کی صداقت پہ اپنی آنکھوں کو مقفل کر لیا۔“ شمس یعنی عبداللہ نے سب کے سروں پہ جیسے بم پھوڑا تو اس سے اٹھنے والے دھوئیں میں چند لمحوں کے لیے تو کسی کو کچھ سوجھائی ہی نہ دے سکا۔

ظہیر میاں نے بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر ٹنگی باندھے دیکھتے ہی چلے گئے۔

”جس طرح بوڑھے لوگوں کے لیے اولڈ ہاؤس ہوتا ہے اسی طرح بچوں کے لیے بھی چلڈرن ہاؤس ہوتا ہے میں وہاں چلا گیا تین سال میں بھی وہاں اپنی بے قصوری کا غم مناتا رہا مگر پھر ایک امیر میلی نے مجھے اپنا بیٹا بنا کر وہاں سے رہائی بخشی پڑھائی کی غرض سے مجھے جرمی بھیجا مگر جب میں واپس آیا تو بد قسمتی سے ان کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار پایا۔ عمرے کے لیے جانے والے ہوائی جہاز کے کریش ہو جانے کے باعث وہ مجھے داغ مفارقت دے گئے میں ایک بار پھر سے تنہا ہو گیا۔

میں نے بہت سوچا آپ کے دروازے پہ جاؤں دستک دوں آپ کو دیکھوں سنوں ایک بار پھر اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں مگر ان ہی سوچوں میں مزید برس سرک گئے مگر پھر کچھ مہینے پہلے میں نے ارادہ کیا اور اسی دروازے پہ گیا جہاں سے روتے ہوئے میری نئی

ہوئے ہوں گے۔“

شفقت میاں نے بولنے سے پہلے تمہید باندھی تو سب نے منتظر نگاہیں ان پہ مرکوز کیں۔

”گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یہ سوچ نہیں رکھنی

چاہیے کہ وہ ساری عمر انسان کا پیچھا کرتے ہوئے اسے

سزاؤں کی پوٹلی میں بند کر دیں گے ہاں اس صورت

میں جب اس گناہ کی خدا کے حضور گڑ گڑا کر معافی

طلب کی جائے تو وہ مزید سزاؤں کا سبب نہیں

بنے۔ خدا کے ساتھ ساتھ نا انصافی کرنے والے اس

کے بندے سے بھی معافی مانگ لی جائے تو دل پہ

لدے بوجھ آسانی سے سرک جاتے ہیں۔ ظہیر نے

صرف تین سال ہی سزا نہیں کائی بلکہ جھوٹے اور بے

حسن لوگوں کا ساتھ دے کر سچی فریاد کو نظر انداز کرتے

ہوئے ان لوگوں سے ملنے والے اذیت ناک صلے کو

بھی چکھا.....“ شفقت میاں کچھ دیر کو خاموش ہوئے

اور پھر بولے۔

”اولڈ ہاؤس میں لگنے والیں بوڑھوں کی پر رونق

محفل میں بھی اس کے دل سے بیٹے کے ساتھ کیے ظلم کا

تعلق نہیں نکال سکیں یہ قلق اسی صورت نکلا جب خدا سے

صدق دل سے بخشش طلب کی گئی اور اس نے ان پہ رحم

فرماتے ہوئے ان کا بیٹا محبت بھرے سابقہ دل سمیت

ہی واپس لوٹا دیا۔ خدا کسی پہ ایسا وقت نہ لائے کہ

با برکت بزرگوں کی خدمت کرنے ان کی دعائیں سمیٹنے

کی بجائے انہیں اولڈ ہاؤس کی نذر کرنا پڑے۔“ انہوں

نے مغموم لہجے میں کہتے ہوئے آنکھوں کے بھیکے کوئے

انگی کی پوروں میں جذب کیے تو سب نے ان کی دعا پہ

صدق دل سے آمین کہا۔

”آپ کی جگہ اس اولڈ ہاؤس میں نہیں بلکہ میرے

ہاؤس میں ہے جہاں آپ کی بہو اپنے سر اور دو پوتے

بے صبری سے اپنے دادا کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس

نے اصل خوش خبری تو اب سنائی جسے سن کر ظہیر میاں

خوش گوار حیرت میں گھر گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ارے پہلے کیوں نہیں بتایا ان ننھے بچوں کو دیکھنے

کو دل چل اٹھا ہے۔“ وہ خوشی سے بہتی آنکھوں کو

پونچھتے ہوئے بولے اور باری باری سب سے ملنے

لگے۔

”بھول مت جانا ہمیں چکر لگاتے رہنا ہم

بوڑھوں کی محفل میں تمہاری کمی باقی رہے گی۔“

شفقت میاں نے بھی اپنی نم آنکھیں پونچھتے

ہوئے کہا تو ظہیر میاں اثبات میں سر کو جنبش دیتے

آگے بڑھنے لگے اور پھر بیٹے کا مضبوط ہاتھ تھامے اولڈ

ہاؤس کی دہلیز پار کرتے ہوئے کھلے آسمان تلے نکل

آئے۔

اللہ نے ان کے آنسوؤں ان کی توبہ کو قبول کرتے

ہوئے انہیں ان کے بیٹے سے ملوایا تھا۔ ضروری نہیں

کہ غلطیاں یا گناہ صرف چھوٹوں سے ہی سرزد ہوں

اکثر بڑے بھی صحیح غلط میں فرق نہ رکھتے ہوئے غلط

راستے کا انتخاب کر بیٹھتے ہیں۔

”بھلے ہمارا ایک دوست اولڈ ہاؤس سے کم ہو گیا

مگر مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک

بہترین جگہ جا رہا ہے۔“

کمرے کی کھڑکی سے سڑک کے پار گاڑی میں

بیٹھتے ہوئے ظہیر اور اس کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے غم

آنکھوں سے شفقت میاں نے کہا۔ وہ اس اولڈ ہاؤس

کے تمام بزرگوں کے سربراہ مانے جاتے تھے وہ دن

رات یہاں کے بزرگوں کا دل لگانے انہیں ہنسانے

میں مصروف رہتے تھے۔

”کچھ باتیں تم سب سے کہنا چاہوں گا میں کیونکہ

تم میں سے شاید کئی لوگ کسی نہ کسی گناہ کا بوجھ اٹھائے